قائداعظم اور اُردو زبان

ہارون راؤ

Haroon Rao

Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

عظیم اللہ جندران

Azeemullah Jindran

Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

Urdu has been playing a basic role in the lives of muslims. In Pakistan, it has given importance to justice, education and tolerance in siciety. When a nation gets important status in the world, then its language becomes a sign of civilization. In this research article an effort has been made to show the deep relationship between a society and its literature. Quaid-e-Azam was aware of the importance of Urdu and wanted to see it as national and official language. Without Urdu Pakistan's educational and social system cannot improve. Urdu can compete with modern languages of the world because it has all qualities for this purpose.

اس دنیا میں عظیم انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ تاریخ کے اوراق بے شک عظیم انسانوں کے تذکروں سے بھرے پڑے ہیں لیکن ان عظیم انسانوں کی پیدائش کے لیے تاریخ کو مدتوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ زمانہ ہزار بار کروٹیں بدلتا ہے، انسانیت اپنے مسائل کے حل کے لیے اپنی آنکھوں کے دروازے وا کیے ہوتی ہے، دعائیں رنگ لاتی ہیں اور پھر انسان پیدا ہوتا ہے جو عظمت کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ اس میں تمام تر قائدانہ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ وہ قوم کے کارواں کو ساتھ لے کر چلنے کے وصف سے مالا مال ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی پیدائش کو معجزہ تصور کیا جاتا ہے اور یہ معجزہ کبھی کبھار نمودار ہوتا

ہے۔ زمین کا وہ ٹکڑا کتنا خوش نصیب ہے جہاں اس دیدہ ور کی آنکھ کھلتی ہے۔ مادر گیتی ایسے فرزندِ جلیل کو جنم دے کر خود بھی فخر محسوس کرتی ہے۔ جس قوم کو ایسا عظیم انسان میسر آ جائے، اس کی خوش قسمتی کا کیا کہنا:

وقت ہی جو بدل دے وہ ہے انسانِ عظیم
وقت کے ساتھ بدلنا کوئی کردار نہیں(۱)

محمد علی جناح ان عظیم و جلیل القدر انسانوں کی صف میں شامل ہیں جن پر برصغیر کے مسلمان جتنا فخر کریں اتنا کم ہے۔

۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کے دن دنیا بھر کے عیسائی کرسمس کا تہوار پوری مذہبی عقیدت اور روایتی جوش و خروش سے منا رہے تھے۔ اسی دن کراچی کی ایک تین منزلہ عمارت ''وزیر مینشن'' کی دوسری منزل پر ایک تاجر خاندان میں ''محمد علی'' نامی بچے نے جنم لیا۔ وہی محمد علی جسے دنیا بانیِ پاکستان کے نام سے جانتی ہے۔ قائداعظم کے جدِّ امجد ساہیوال (پنجاب) کے ''لوہانہ راجپوت'' تھے۔ جو کئی سال پہلے تلاشِ روزگار کے لیے گجرات کاٹھیا واڑ کی ریاست گونڈل کے قصبے پانیلی میں آباد ہو گئے تھے۔ وہاں خواجہ خاندان میں ان کی شادی ہو گئی اس طرح ان کا خاندان بھی خواجہ خاندان کہلانے لگا۔ قائداعظم کے والدِ گرامی کا نام پونجا بھائی جناح تھا۔ گجراتی زبان میں ''جینا'' دبلے پتلے آدمی کو کہتے ہیں۔ یہی لفظ بعد میں جناح بنا اور پھر یہ کہ ان کا خاندانی نام بن گیا۔ پونجا جناح بہت محنتی اور ذہین آدمی تھے، وہ بہتر معاش کے لیے پانیلی سے کراچی آئے اور اپنی ہمت، ذہانت اور محنت سے ایک خوشحال تاجر بن گئے۔ قائداعظم کی والدہ مٹھی بائی کو مذہب اور بزرگانِ دین سے بہت عقیدت تھی۔ اسی لیے آپ کا نام انھوں نے محمد علی رکھا۔

قائداعظم نے شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا۔ انہوں نے انگریزوں، سکھوں اور ہندوؤں کی مشترکہ قوتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اصولوں کی جنگ میں محمد علی جناح کبھی نہیں ہارے۔ وہ دانائے راز، ایک نئے فلسفہ حیات کے موید، وہ مردِ مومن جس کی ضرب میں حضرت کلیم کی معجزائی تھی اور اعجازِ مسیحائی بھی کہ اس نے ایک مردہ قوم کے عروق میں زندگی کا خون داخل کیا۔ اس خون میں حدّت ان کے ذاتی کردار نے پیدا کی۔ قدرت جب کسی قوم پر مہربان ہوتی ہے تو اس میں اس طرح کے بطلِ جلیل پیدا کرتی ہے۔ اور جب کسی قوم سے ناراض ہوتی ہے تو وہاں قحط الرجال پیدا کر دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے:

سمجھتا ہے تُو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی(۲)

یہ ایک حیران کن بات ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا رہن سہن، نشست و برخاست، چال ڈھال، لباس و پوشاک، عادات و اطوار اور بول چال ہندوستان کے عام مسلمانوں سے یکسر مختلف تھی، کیسے ان کے دلوں کی دھڑکن بن گیا اور وہ اس کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے پر تیار ہو

گئے۔ قائداعظم نے ایک بے جہت قوم کے لیے منزل کا تعین کیا، اس کے حصول کے لیے راہِ نوردی کی تڑپ پیدا کی اور خضرِ راہ بن کر اسے منزلِ مراد تک پہنچا کر دم لیا۔

قائداعظم کو قدرت نے بے مثل جسمانی اور ذہنی خوبیوں سے نوازا تھا۔ دراز قد، سرخ وسفید رنگ، کشادہ پیشانی، عقابی نظر، دھیمی مگر پاٹ دار آواز۔ اس دور میں ان جیسا بارعب اور پروقار رہنما کوئی اور نہیں تھا۔ ہزاروں کے مجمعے میں وہ دور سے پہچانے جاتے اور ان کی ذات کا سحر لوگوں کو دور سے اپنی طرف کھینچ لیتا، ذہنی صلاحیتوں اور عظمت کردار کے حوالے سے اس وقت ہندوستان بھر میں ان کا ہم پلہ کوئی سیاست دان نہ تھا۔ ان کی ذات کے حوالے سے ڈاکٹر زوار حسین زیدی ''ارشاداتِ قائداعظم'' میں لکھتے ہیں:

> ''وہ نہ صرف ایک بے مثل وکیل، پارلیمنٹیرین اور مدبر تھے۔ بلکہ ایک لاجواب انسان بھی تھے۔ ان کی سیرت بے داغ اور ان کا کردار انسانی خوبیوں کا ایک ایسا مجموعہ تھا جسے اپنے اور بیگانے سبھی اپنی زندگی کا نمونہ بنا سکتے ہیں۔ صاف گوئی، ریاکاری سے پرہیز، نام نمود سے بے نیازی، خوداعتمادی، کم آمیزی، دوست دشمن سے خوش خلقی چھوٹوں سے شفقت، بڑوں کا احترام، کفایت شعاری، اصولوں کی پاسداری اور خودداری ان کا شعار تھا۔ خوراک، پوشاک، بات چیت، اطوار وعادات اور رہن سہن غرضیکہ زندگی کی ہر جہت میں وہ نفاست متانت اور وقار کا پیکر تھے۔''(۳)

قائد نے ہمیشہ اصولوں کی پاسداری کی۔ ان کے طریقِ کار میں مثالی باقاعدگی تھی۔ جب ایک دفعہ انہوں نے سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کر لیا تو وہ پہاڑ کی طرح اٹل ہو جاتا۔ بڑی سے بڑی مشکل یا مصلحت ان کے پایہ استقامت کو ڈگمگا نہ سکتی تھی۔ کوئی لالچ ان کو اپنے اصولوں سے منحرف نہیں کر سکتا تھا۔ تحریکِ زبان میں اردو کے کردار سے قائداعظم نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اردو زبان وادب کی اہمیت کو بھی بخوبی جانتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ زبان کسی قوم کی زندگی میں کیا مقام رکھی ہے۔ آئندہ صفحات میں قائد کے افکار کی روشنی میں اردو زبان وادب کے مقام ومرتبے کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے گی، لیکن اس سے پہلے زبان اور اردو زبان کے کچھ پہلوؤں کا تذکرہ ضروری ہے۔

زبان ان باقاعدہ آوازوں کے مجموعے کو کہتے ہیں جن کے ذریعے خیالات واحساسات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ آوازوں کے مخارج، طرزِ ادا ماہیت اور نوعیت مل کر معنوی ساختوں کو جنم دیتے ہیں۔ زبان فکر وبیان، افہام وتفہیم اور تشریح وتوضیح کے حوالے سے بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ اظہار وابلاغ کا ایک کارآمد ذریعہ (source of communication) ہے۔ اس کی مدد سے ہم اپنی بات

دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور زبان کے توسط سے شعور و آگہی کو فکر اور سوچ کی باقاعدہ صورت ملتی ہے۔ زبان معاشرے اور سماجی گروہوں میں معاونت اور یک رنگی کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ زبان میں الفاظ اور جملے انسانی خواہشات کی ترجمانی کا فریضہ احسن طریقے سے سرانجام دیتے ہیں۔ اس حوالے سے عتیق احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''زبان کیا ہے؟ زبان دراصل مفروضہ صوتی علامات کا مجموعہ ہے جسے انسان اپنے مافی الضمیر کے ابلاغ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ابلاغ کے عمل اور ردّعمل اور اس کے تکرار سے ان صوتی علامتوں کے معنی اور تعبیرات متعین ہوتی ہیں۔''(۴)

زبان کا ڈھانچہ صوتی علامات سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ صوتی علامات ہماری وضع کردہ ہوتی ہیں۔ ان علامات کو مختلف وجوہات کی بنا پر مختلف اشیاء کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور یہ علامات سالہا سال کی تاریخ اور روایات پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان کے استعمال میں شعوری اور غیر شعوری دونوں قسم کی کوششوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔

زبان فکری منصب اور ذہنی سرگرمیوں میں بھی فعال کردار ادا کرتی ہے۔ جو حقائق ذہن کے خوابیدہ حصوں میں موجود ہوتے ہیں انہیں فہم و ادراک تک لانا اور سوچوں کی تنظیم کرنا اور ان کو معنوی روپ پہنانا بھی زبان ہی کا کردار ہے۔ زبان فکر و سوچ کا تعلق بول چال سے پیدا کرتی ہے اور ابلاغ و ترسیل کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔ تصور سازی اور تمثال گری کا فن زبان کا مرہونِ منت ہے۔ انسانی ذہن کے ارتقاء اور تہذیبی و ثقافتی ترقی میں سب سے زیادہ بنیادی کردار زبان ادا کرتی ہے۔ زبان انسان کی سماجی زندگی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر سماجی رشتوں کے استحکام کا تصور بے معنی ہے۔ تعلیم و تربیت کا فریضہ زبان کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ تمام مخلوقات سے انسان کو ممتاز کرنے والی زبان ہی ہے، اس خصوصیت کے باعث انسان کو حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی رائے میں:

> ''زبان خیالات کا مجموعہ ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے تمام خیالات کی ترجمانی کرے۔ اس ترجمانی میں وہ حرکات جسمانی بھی شامل ہیں جو کسی مفہوم کے سمجھانے کے لیے خاص خاص زبان بولنے والوں کے درمیان مشترک ہوتی ہیں۔ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوتِ گویائی شامل ہے اور

جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے
ارادے سے دہرا سکتا ہے۔''(۵)

تعلیم اور تعلم کے لیے سب سے آسان، واضح اور مکمل ذریعہ زبان ہے۔ انسان فکر و احساس کی باریکیاں اور تخیل و تصور کی نزاکتیں زبان کا سہارا لیے بغیر بیان نہیں کی جا سکتیں۔ علم کے حصول و ابلاغ کے لیے زبان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ تدریس کے تمام اقدامات میں زبان ناگزیر ہے۔

ہر قوم کی کچھ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز اور منفرد کرتی ہیں۔ ان خصوصیات کو قومی امتیازات یا شعائر بھی کہا جا سکتا ہے۔ زبان ایک بہت بڑا قومی شعار ہے۔ ہر قوم اپنی الگ قومی شناخت رکھتی ہے۔ یہ زبان اس کے مخصوص قومی فکر و ذہن کی محافظ اور مخصوص تہذیبی مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ زبان کسی قوم کی سوچوں کی راہ متعین کرتی ہے۔ ہر قوم کے لیے اپنی زبان کا احترام ضروری ہے، احترام کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ اپنی زبان بولتے اور لکھتے وقت فخر محسوس کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ زبان کی صحت و صفائی کا خیال رکھا جائے اور اسے بہتر بنانے اور سنوارنے نکھارنے کی سعی کی جائے۔ تیسرا یہ کہ زبان کے علمی و ادبی سرمائے میں قابل قدر تخلیقی اضافے کیے جائیں۔ نیز اس زبان کی اشاعت کے لیے مسلسل جدوجہد کی جائے۔

آج اگر غیر جانبدارانہ انداز میں دیکھا جائے تو پاکستان میں اردو کے سوا کوئی اور زبان ایسی موجود نہیں ہے جو ملک کے ہر خطے اور علاقے میں سمجھی جا سکے اور جس کا سہارا لے کر ہر شخص اپنا مافی الضمیر بیان کر سکے۔

برصغیر کے تقریباً تمام علاقوں کی تہذیب ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کے باعث ایک مخلوط کلچر اور ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ یہ اثرات اردو پر بھی موجود ہیں۔ اس کی نشو و نما میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کا بنیادی کردار ہے۔ اردو افعال کی اکثریت سنسکریت، پراکرت اور دیسی زبانوں پر مشتمل ہے۔ کچھ افعال فارسی کے ہیں عربی کے بہت تھوڑے افعال کو اردو میں شامل کیا گیا ہے۔ اسما میں پچھتر فیصد سے زیادہ ہندوستانی اور پچیس فیصد غیر ملکی ہیں۔ حرف، ربط، تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور دیگر ادبی روایات کا احوال بھی تقریباً ایسا ہی ہے۔ اردو شعر و ادب اپنے لب و لہجہ کے لحاظ سے برصغیر کی پیداوار ہے۔ یہ دوسری زبان سے سمجھوتے اور مفاہمت کے اصول پر عمل کرتی ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''اردو کی اسی روایت کے پیش نظر انشا نے ''دریائے لطافت'' میں
ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جو لفظ اردو زبان
میں آ گیا ہے وہ اردو ہے خواہ اصل کچھ ہو اور جس طرح اردو میں
بولا جاتا ہے اسی طرح صحیح ہے چاہے از روئے اس کا استعمال غلط ہو

اس کا یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ تمام الفاظ ولغات جو اردو میں آ گئے ہیں وہ دخیل ہو گئے اردو میں اور اردو رہیں گے۔ظاہر ہے کہ زبان نے اپنی یہ روایت ترک نہیں کر دی، آئندہ بھی اردو میں الفاظ اسی طرح دخیل ہوتے رہیں گے اردو کی نشو ونما میں مدد ومعاون ثابت ہوں گے۔''(۶)

زبان کسی علاقے میں مسلّط نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کے پیدا ہونے اور نشو ونما پانے کا عمل نہایت نرمی کے ساتھ خود اختیاری انداز میں ہوتا ہے۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے جہاں دوسرے عوامل پیش پیش رہے وہیں صوفیائے کرام نے اس کی ترقی اور نگہداشت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان صوفیائے کرام کے دروازے عوام الناس کے لیے کھلے رہتے تھے۔انہوں نے عوام کے دلوں کو تسخیر کے لیے عوامی بولی کو اختیار کیا۔دین کی تعلیم کی نشر واشاعت کے لیے بھی اردو زبان کو برتا گیا۔گویا اردو زبان کو مذہبی سرپرستی بھی حاصل رہی لیکن زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ہر مذہب کے لوگوں کے لیے اس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

جس زبان میں کسی بھی قوم کا تہذیبی ،ثقافتی اور مذہبی ورثہ موجود ہو اسے قومی زبان کہا جاتا ہے۔ یہ زبان پورے ملک میں مشترکہ ذریعۂ اظہار ہوتی ہے۔ برطانیہ میں رہنے والوں کے لیے انگریزی، سعودی عرب کے لیے عربی ،چین میں رہنے والوں کے لیے چینی زبان کی جو اہمیت ہے یقیناً پاکستانیوں کے لیے اردو زبان اسی قدر ومنزلت کی حامل ہے۔کسی بھی ملک کے باشندوں کو فکر وآہنگ کی ایک روش پر چلانے کے لیے مشترکہ زبان بنیادی کردار ادا کرسکتی ہے۔ پاکستان کی تمام اکائیوں کو متحد اور یک جان رکھنے کے لیے اردو زبان جو کردار ادا کرسکتی ہے اس سے بابائے قوم آگاہ تھے۔ان کی دور اندیش نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ کونسی زبان اس خطے کی سرکاری زبان ہونی چاہیے۔آپ نے اس حوالے سے فرمایا:

''اگر پاکستان کے مختلف حصوں کو باہم متحد ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کی سرکاری زبان ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ میری ذاتی رائے میں اُردو اور صرف اُردو ہے۔''(۷)

(جلسہ تقسیم اسناد ڈھاکہ یونیورسٹی ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء)

اردو نے ابتداء اور ارتقاء کا سفر مسلمان حکمرانوں، بزرگان دین اور اکابرین ادب کے توسط سے کیا ہے۔مسلمان حکمرانوں نے فارسی اور مقامی زبانوں کی قربانی دے کر اردو کو گلے لگایا۔ابتدا میں اس زبان کو جنوبی ہند میں پزیرائی ملی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے شمالی ہند کے دروازے بھی اپنے لیے وا کر لیے اور یہاں کے حکمرانوں اور عوام نے اس کو گلے لگا لیا۔اس طرح اس زبان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔مسلمانوں کا اس سے تعلق دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ رہا ہے۔اس حوالے

سے ڈاکٹر سیّد عبداللہ رقم طراز ہیں:

''جدید تر زمانے میں اردو زبان میں اگر چہ سادگی اور سلاست اور روزمرہ نگاری کا رجحان بھی پیدا ہوا ہے مگر ملکی وسیاسی وجوہ روز بروز اردو کو خالص مسلمانوں کی چیز بناتے چلے گئے جس کی وجہ سے اردو مشترک زبان ہونے کے باوجود مسلمانوں کے احساسات وافکار سے وابستہ ہوگئی ہے۔اور اردو بالآخر وہ زبان قرار پائی جس کی ترقی وتعمیر بلکہ تحفظ وبقا کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر آپڑی۔''(۸)

اردو زبان اسلامی عقیدے کے قریب تر کرتی ہے اس کے رسم الخط نسخ اور نستعلیق کا تعلق قرآن وحدیث کی کتب سے ہے۔اس کے رسم الخط کو دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے۔اس طرح اس کا تعلق فطرت سے قریب تر ہے۔طوافِ کعبہ بھی دائیں طرف سے بائیں طرف کو ہے۔اردو ایشور اور بھگوان کی بجائے اللہ اور خدا کی حقیقت سے آگاہ کرتی ہے۔اردو پر عربی اور فارسی کے گہرے اثرات ہیں۔ان دونوں زبانوں میں ادب کے وسیع ذخائر ہیں۔اس طرح اردو نے ان زبانوں سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔اردو کی وجہ سے ہمارے تعلقات مشرقِ وسطیٰ اور عرب ممالک سے تہذیبی اور لسانی سطح کے ہیں۔قرآنی حروف اور اردو کے حروفِ تہجی میں مشابہت عربی اردو دونوں زبانوں کو قریب کرتی ہیں۔قومی زبان کی حیثیت سے اس زبان کی افادیت اور اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔اس زبان نے علاقائی زبانوں سے بہت سے الفاظ کو اپنے اندر مدغم کیا ہے اور وہ بھی اب اردو کے الفاظ محسوس ہوتے ہیں۔اس طرح ان الفاظ کی اہمیت دوہری ہوگئی ہے۔علاقائی زبانوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہوتا لیکن قومی زبان پر بھرپور توجہ دینا از حد ضروری ہوتا ہے۔جنگ آزادی اردو نے ہمارے ساتھ مل کر لڑی ہے۔اردو یہاں کے مسلمانوں کا قومی تشخص ہے۔تحریک آزادی کی مخالف قوتیں اردو کو بھی ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی رہیں۔زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا،مگر ہندو اس زبان کو مسلمان ثابت کرنے پر تلے رہے۔سب سے بڑا جواز یہ پیش کرتے رہے کہ اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔اس طرح آزادی کی کوششوں کے دوران میں اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کے خاتمے کی ہر ممکن کوشش کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔اس حوالے سے ڈاکٹر رابعہ سرفراز یوں رقم طراز ہیں:

''آزادی کی کوششوں کے دوران اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کے خاتمے کی جو کوششیں کی گئیں انہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اردو زبان کے حوالے سے گاندھی جی کا یہ موقف تھا کہ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی ہے یقیناً قابلِ

توجہ ہے۔''(۹)

زبان کسی بھی قوم کے تہذیبی وثقافتی افکار کا مظہر ہوتی ہے۔ دنیا میں فتح ونصرت نے ہمیشہ ان لوگوں کے قدم چومے ہیں جنھوں نے اپنی تہذیب اور زبان کو ہمیشہ اپنے لیے باعثِ صد افتخار سمجھا۔ لہٰذا زبان نہ صرف کسی قوم کی مجموعی تہذیبی اقدار اور سماجی روایات کو پروان چڑھاتی ہے بلکہ اتحاد و یگانگت اور بالخصوص یک رنگی اور خیالات میں ہم آہنگی کو بھی فروغ دیتی ہے۔ اور قوموں کی ترقی اور تنزل کا انحصار بھی زبان پر ہوتا ہے۔ جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیالات ایک نہیں اور جہاں خیالات ایک نہیں وہاں فکر وفلسفہ ایک نہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد ارشاد اویسی یوں رقمطراز ہیں:

> ''بابائے اردو نے فرمایا کہ'' قومیت کے لیے یک رنگی، یک رنگی کے لیے ہم خیالی، ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی ضرورت ہے۔ جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیالات کا رنگ ایک نہیں، جہاں خیالات ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔ یہ دلوں کو جوڑتی اور بے گانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے'' انہوں نے مزید کہا کہ'' زبان کی ترقی وانحطاط معاشرتی حالات کے تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے لسانیات تمدن و معاشرت کی تاریخ کو زبان کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔''(۱۰)

بیسویں صدی کی ابتداء میں جب برصغیر کے مسلمانوں نے الگ قومیت کا نعرہ لگایا اور اقوام عالم میں ایک نئی مملکت کو تخلیق کیا تو اس مملکت کے لیے زبان کے مسئلے نے سر اٹھایا۔ اس حوالے سے حضرت قائداعظم کا مؤقف بڑا ٹھوس اور واضح تھا۔ انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کی تقریر میں اردو کو ایک نئی مملکت پاکستان کی سرکاری زبان قرار دے کر اس کی اہمیت کو پوری دنیا پر آشکار کر دیا۔ قائداعظم کے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کے جلسۂ عام کی تقریر کا اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''میں آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ جہاں تک آپ کی بنگالی زبان کا تعلق ہے۔ اس افواہ میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ آپ کی زندگی پر کوئی غلط یا پریشان کن اثر پڑنے والا ہے۔ بالآخر اس صوبے کے لوگوں ہی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ اس صوبے کی زبان کیا ہوگی۔ لیکن یہ میں آپ کو واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور صرف اردو اور اردو کے سوا کوئی زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد

نہیں ہوسکتی اور نہ کوئی کام کرسکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اٹھا
کر دیکھ لیجیے پس جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے وہ
اردو ہی ہوگی۔'' (۱۱)

مندرجہ بالا قائد کے ارشادات سے بخوبی یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں اردو زبان کی لسانی اور ثقافتی اہمیت روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔ وہ نئی مملکت کی تمام اکائیوں کو متحد رکھنے کے لیے اردو زبان کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ قائداعظم نے جلسۂ تقسیم اسناد ڈھاکہ میں کچھ مزید ارشادات فرمائے جن کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

''اس صوبے میں دفتری استعمال کے لیے اس صوبے کے لوگ جونسی
زبان بھی چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ خالصتاً صرف اس
صوبے کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق حل ہوگا۔ البتہ پاکستان
کی سرکاری زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں ک درمیان افہام وتفہیم
کا ذریعہ ہو، صرف ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ اردو ہے۔ اردو کے سوا
کوئی زبان نہیں ہے اور وہ زبان ہے جس کو برصغیر کے کروڑوں
مسلمانوں نے پرورش کیا ہے۔ پاکستان کے ایک سرے سے
دوسرے سرے تک سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو دوسری صوبائی
اور علاقائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات
کے بہترین سرمائے پر مشتمل ہے۔ اور دوسرے اسلامی ملکوں کی
زبانوں سے قریب تر ہے۔ یہ بات بھی اردو کے حق میں جاتی ہے کہ
اور یہ بہت اہم بات ہے کہ بھارت نے اردو کو دیس سے نکالا دے
دیا ہے۔ حتیٰ کہ اردو رسم الخط کو بھی ممنوع قرار دے دیا ہے۔'' (۱۲)

پاکستان کے پہلے دستور میں ۱۹۵۶ء میں دو زبانوں اردو اور بنگلہ کو قومی زبانوں کا درجہ دے کر اردو کے مسئلے کو اور شدید تر بنا دیا گیا۔ اس دستور کے مطابق پارلیمنٹ کے ارکان اردو، انگریزی اور بنگلہ میں تقریر کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ثانوی سکولوں میں اردو، عربی اور بنگلہ زبان کی تدریس کی جائے گی۔ اس دستور کی خطرناک لسانی شقوں نے قائداعظم کے قومی زبان کے تصورات کی نفی کی اور ملکی بقا، سالمیت اور خودمختاری کو خطرے میں ڈال دیا۔

اردو کو ۱۹۷۳ء کے آئین کی رو سے قومی زبان کی حیثیت دی گئی اور اس آئین کی شق ۲۵۱ کے تحت پندرہ سال کے عرصے میں اردو کو سرکاری اور دفتری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا۔ آئین کے مطابق ۱۹۸۸ء میں اردو کو دفتری اور سرکاری زبان بننا تھا مگر تاحال ایسا ممکن نہیں ہوا ہے۔ سرکاری شعبے میں اس

زبان کو ابھی تک پزیرائی نہیں مل سکی۔ حالانکہ اردو زبان کا دامن اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ اس کو کسی بھی بین الاقوامی زبان کے برابر رکھا جا سکتا ہے۔ اُردو بلاشبہ ایک ترقی یافتہ زبان ہے اور اس کے اندر یہ صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں کہ اسے ہر طرح کے تعلیمی، علمی، قانونی، تکنیکی، سائنسی اور دفتری مطالب و مقاصد کے اظہار و بیاں اور وضاحت و تشریح کے لیے بلاخوف و خطر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اردو کو پہلے ریاست بہاول پور اور دیگر کئی ریاستوں میں بطور سرکاری زبان استعمال کیا جا چکا ہے۔ اس طرح جامع عثمانیہ میں تمام مضامین اردو میں پڑھانے کا تجربہ بھی کیا جا چکا ہے۔

پاکستان میں اس قومی زبان سے بے اعتنائی کی سب سے بڑی وجہ ملک میں اقتدار و اختیار پر مسلط وہ طبقہ اور ان کی اردو دشمن مساعی ہیں۔ جو خود انگریزی زبان کا پروردہ ہے اور بدیسی زبان، کلچر اور ثقافت سے افسوس ناک حد تک مرعوب ہے۔ یہ طبقہ قومی زبان کی فضیلت و برتری کو مٹانے کے لیے ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ اس طبقے کا یہ کہنا کہ اردو کو اپنا کر سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ترقی نہیں کی جا سکتی، غلط ہے کیونکہ چین اور جاپانی جیسے بہت سے ملکوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی انگریزی کی بجائے اپنی زبان میں علوم و فنون کی ترسیل سے کی ہے۔

اردو کو قومی زبان کے طور پر فروغ دینا اور اسے سرکاری و دفتری زبان بنانا قومی یک جہتی اور اتحاد کے لیے ضروری ہے۔ بلکہ اقوام عالم کے درمیان سربلندی اور فخر و ناز کا بھی باعث ہے۔ انگریزی بہرحال ایک غیر ملکی زبان ہے اور ہمارے جیسے ترقی پزیر ملک کے باشندوں کے لیے اس پر مکمل عبور حاصل کرنا ایک دشوار اور غیر ضروری عمل ہے۔ ہماری بہت سی صلاحیتیں ایک غیر ملکی زبان کو سیکھنے اور سمجھنے میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ انگریزی زبان کی بے جا بالادستی کو ختم کر کے اور قومی زبان کو فروغ دے کر خواص اور عوام کے درمیان خلیج کو کم کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان، پاکستانی اور اردو ایک مثلث ہے اس کا ہر پہلو ایک دوسرے کی تقویت کا سبب ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نیم پلیٹ، سائن بورڈ، دعوتی رقعہ جات، تعارفی کارڈ، خط و کتابت اور گفتگو میں نہ صرف اردو کو برتا جائے بلکہ اس پر فخر و انبساط محسوس کیا جائے۔ انگریزی کے بے جا پیوند ہمارے احساس کمتری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر علامہ اقبال نے لکھا تھا کہ:

> ''فی زمانہ انگریزی زبان کی طرزِ تحریر اردو زبان پر بہت بڑا اثر کر رہی ہے۔ موجودہ اردو اخبارات اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی بولی انگریزی زبان کے الفاظ و محاورات سے معمور ہوتی ہے۔ اگرچہ مستند اردو مصنفین کی تحریروں میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو چنداں دخل نہیں ہے۔ تاہم بہت سے الفاظ آہستہ آہستہ ان کی تحریروں میں آتے جاتے ہیں۔ (مثلاً توبۃ النصوح کے مصنف

نے الفاظ اانٹرنس، فری میسن، ربڑ، پنسل، ڈاکٹر وغیرہ کو استعمال کیا
ہے) اور ان کی طرزِ تحریر اور لکھنے کا ڈھنگ انگریزی طرزِ ادا سے
متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اس اثر کا نتیجہ خود واضح ہو جائے گا۔''(۱۳)

اردو زبان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ طبقہ ہے جو انگریزی کے توسط سے اپنی بالادستی کا خواہش مند ہے۔ ہمیں سنجیدگی اور پوری دیانتداری کے ساتھ، وطنِ عزیز کی سالمیت کی خاطر ملک کے مختلف خطوں میں فکری ہم آہنگی اور یک جہتی کے لیے اردو زبان کو نہ صرف وطنِ عزیز میں فروغ دینا ہے بلکہ اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہر ممکن جتن کرنا ہے۔ اس سے نظریہ پاکستان کو نا صرف یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ جب انگریزی کی بجائے اردو بولنا ہمارے لیے سرمایۂ افتخار بن جائے گا اور ہم نیک نیتی اور صدقِ دل سے اپنے اپنے دائرہ اثر میں قومی زبان کو فروغ دینے کا عزمِ صمیم کر لیں گے تو تب ہی اردو کو اس کا جائز اور حقیقی مقام ملے گا اور پھر دنیا کی فکری طور پر زندہ اقوام میں ہمارا شمار ہوگا اور ہم دنیا میں ایک باوقار اور خوددار قوم کی حیثیت سے اپنا سر فخر سے بلند کر کے چل سکیں گے۔ صرف اس طرح ہم قائد کی روح کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ سکتے ہیں اور اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، گل رستہ تقاریر، لاہور: مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، ۲۰۱۶ء، ص:۹۰

۲۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع نہم، ۲۰۰۹ء، ص:۴۵۴

۳۔ زوار حسین زیدی، ڈاکٹر، ارشاداتِ قائداعظم، لاہور: کلاسیک، ۲۰۰۸ء، ص:۱۸۔۱۷

۴۔ عتیق احمد صدیقی، رسم الخط اور زبان کا تعلق، مشمولہ: اردو رسم الخط، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء، ص:۳۷۵

۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، لسانی مقالات، حصہ سوم، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء، ص:۱۳

۶۔ رابعہ سرفراز، ڈاکٹر، اردو زبان اور بنیادی لسانیات، فیصل آباد: مثال کتاب گھر، ۲۰۱۵ء، ص:۴۲

۷۔ مولف ندارد، ارشاداتِ قائداعظم، لاہور: جان بک ڈپو ایجوکیشنل پبلشرز، س ن، ص:۱۴۴

۸۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، مباحث، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، ص:۱۴۵

۹۔ رابعہ سرفراز، ڈاکٹر، اردو زبان اور بنیادی لسانیات، ص:۴۶

۱۰۔ محمد ارشد اویسی، ڈاکٹر، مضمون: قومی یک جہتی کے لیے اردو ناگزیر ہے، مشمولہ: مجلّہ العلم، لاہور: لاہور گیریژن یونیورسٹی، شمارہ۴، ۲۰۱۷ء، ص:۶۷

۱۱۔ عبداللہ سیّد، ڈاکٹر، تحریک نفاذ اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص:۴۸

۱۲۔ ایضاً، ص:۴۹

۱۳۔ رابعہ سرفراز، ڈاکٹر، اردو زبان اور بنیادی لسانیات، ص:۵۱